© rasailojaraid.com

فلسطینی تاریخ نویسی اور سرزمین فلسطین

تحریر: ریجل میسی نائے*

ترجمہ: پروفیسر کشور سلطانہ

مشہور کہاوت ہے کہ فاتح ہی تاریخ کا رُخ متعین کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس فلسطینی قوم مفتوح ہونے کے باوجود خود ہی گزشتہ صدی سے اپنی تاریخ قلمبند کرنے کی ذمہ داری انجام دے رہی ہے۔ یہ حقیقت ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے گی کہ آخر کیوں ایک طرف تو ان کی تقریریں اور تحریریں متنازعہ، معذرت خواہانہ اور دفاعی نوعیت کی ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان میں سے جارحانہ جذبات جھلکتے ہیں اور وہ اس بات کے لیے پرعزم نظر آتے ہیں کہ اپنی شرمندگی کا بوجھ فاتحین کے کندھوں پر ڈال دیں۔

اس مضمون میں ہم اپنی توجہ گزشتہ ۲۵ سالوں میں سامنے آنے والی تاریخی تحریروں پر مرکوز رکھیں گے اور فلسطینی دانش وروں کی ان آراء کا تجزیہ کریں گے جو انہوں نے فلسطین کے علاقے کے بارے میں اپنی تحریروں کے ذریعے واضح کیں اور وہ نمایاں دعوے جو انہوں نے فلسطینیوں کو اس علاقے سے منسوب کرنے کے لیے کیے۔ دوسرے عرب دانش وروں کو نظر انداز کیے بغیر ہم فلسطینی دانش وروں کی تحریروں کا جائزہ لیں گے مگر اس عمل میں غیر فلسطینی عرب دانش وروں کی تحریروں سے بھی صرف نظر نہیں کیا جائے گا کیونکہ فلسطینی تاریخ نویسی کی کوششوں میں انہوں نے اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ فلسطینی ان کو ایک قابل اعتبار ذریعہ سمجھتے ہیں اور اکثر ان کی

* زیرنظر مضمون Middle Eastern Studies, Vol. 42, No, 6, November 2006 میں Palestinian Historiography in Relations to the Territory of Palestine کے عنوان سے شائع ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریروں اوران کے مصنفین کا حوالہ بھی دیتے رہتے ہیں۔

اس تحقیق کا ذریعہ وہ تاریخی تحریریں ہیں جو ان اٹھارہ قابل ذکر اور نمایاں فلسطینی مورخین کی تصنیف ہیں جو اسرائیل اور دوسرے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے چار عورتوں سمیت گیارہ بشمول چار اسلامی فلسطینی اور تین غیر پیشہ ور تاریخ دان شامل ہیں۔ ہم ان چار غیر فلسطینی عرب دانشوروں کی تحریروں کا بھی جائزہ لیں گے ان کے ساتھ ساتھ ہم فلسطینی دانش ور ایڈورڈ سعید کی بھی کچھ تحریروں کے حوالے دیں گے کیونکہ ایڈورڈ سعید مشرقی تہذیب و معاشرت اور فلسطین کے حوالے سے تحقیق میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اس لیے بھی کہ انہوں نے بعد از نوآبادیاتی نقطہ نظر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ابتدائی فلسطینی تاریخ نویسی کی جانچ پڑتال عرب، یہودی اور یورپی تاریخ نویس کر چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

فلسطینی مورخ عدنان ابوغزالہ نے مینڈیٹ دور کے آخر تک کے مورخین کا جائزہ لیا۔ اسی تحریر پر ایک اور فلسطینی مورخ طریف الخالد نے نظر ثانی کی۔ ژیہوشواپورتھ ایک اسرائیلی مورخ نے ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کی فلسطینی تاریخ نویسی کی شروعات پر نظر ثانی کی۔ تین مورخین، عین الصفری، وعدی البوسلانی اور جارج انطونیس کے کاموں پر اسی دور میں کینتھ سیٹن نے بھی تحقیق کی ہے۔ اس کے ایک دہائی بعد میرَلٹ وِک نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد فلسطینی تاریخی تحریروں میں ہونے والی ترتیب کا ذکر کیا اور ان محققین کی کوششوں کا جائزہ لیا جو فلسطینیوں کی توجہ عربی شناخت اور ارضِ موعودہ کے تصور سے ہٹا کر قومی شناخت کی طرف مائل کر رہے تھے۔ اس موضوع پر بالکل نئی تحقیق مصطفیٰ بدران نے کی جنہوں نے برطانوی قبضے کے دور کے دوران فلسطینی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا۔

فلسطینی تاریخ نویسوں سمیت عربوں نے مشرق و مغرب کے مابین مذہبی و ثقافتی کشمکش کو مدنظر رکھتے ہوئے آخر کار تاریخ نویسی میں سیاسی اور ثقافتی معاملات کی شمولیت کی اہمیت اور افادیت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتراف کرلیا ہے۔

گویا یہ صدیوں پرانی کوشش کا سلسلہ ہے جس کے حوالے سے عرب ساتویں صدی عیسوی میں بازنطین یا مشرقی رومن سلطنت پر مسلمانوں کی فتح کو کامیابی کی پہلی سیڑھی گردانتے ہیں۔ کامیابیوں کا یہ سلسلہ صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبی جنگوں میں فتح کی صورت میں اپنے عروج پر تھا اور آج اکیسویں صدی میں یورپی دنیا کا خود کو یورپ مخالف بنیاد پرست طاقتوں اور مسلمانوں کی دہشت میں گھرا ہوا محسوس کرنا بھی انہی کوششوں کا ایک نتیجہ ہے۔

اس بات پر یقین کہ صیہونی تاریخ نویسوں نے جانبدارانہ اور غلط تاریخ لکھ کر دنیا کی حمایت حاصل کر لی ہے، عرب اس خوف میں مبتلا ہو گئے کہ آخر لوگوں کی ایک تعداد اس پروپیگنڈہ مواد سے ضرور متاثر ہوگی۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ معلومات مطبوعات اور تاریخی تحقیق کو تشہیری مقاصد کے لیے فروغ دینا فلسطین کی آزادی کے حصول کے لیے قومی سطح کی کوششوں ہی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔

اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی توجہ، صیہونی تحریروں اور نقطہ نظر کو ساختِ نو کے عمل سے گزارنے اور فلسطینی نقطۂ نظر کو دنیا کے سامنے پیش کرنے پر مرکوز کر لی تاکہ تاریخ کے فیصلے اپنی پسند کے رُخ سے دکھا سکیں اور ان پر نظر ثانی کا حق حاصل کر سکیں۔ اپنی کتب کے دیباچوں میں انہوں نے اس بات کا باضابطہ اعلان کیا کہ وہ درست تاریخ قلمبند کریں گے تاکہ فلسطینیوں اور دنیا پر صیہونیوں کے جھوٹے پرچار کے تاثر کو درست کر سکیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جعل سازی یا دھوکہ دہی کا لفظ فلسطینی تاریخ نویسی میں بارہا آیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ لفظ تحریف کا نیا جنم ہے۔ اس الزام نے دونوں دینی اور سیکولر مورخین کی صیہونیوں کی تاریخ نویسی کی خصوصیت کو واضح کرنے کا مقصد حاصل کرنے میں بھرپور مدد کی۔ اس پوری صورت حال کا اندازہ لگانے کے لیے کچھ کتب کے عنوانات کی جھلک ہی کافی ہے مثلاً

- ہماری تاریخ دشمنوں کی جعل سازی کے نرغے میں اور بیٹوں کے تعصب زدہ ذہن

(Our History among the Enemy's forgery & Biased mind of the sons)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

• صہیونی دعووں کے درمیان فلسطینی سرزمین اور تاریخی حقائق
(Palestinian Land among Zionist claims & Historical facts)

• خدائی وعدے اور جھوٹے یہودی وعدے کے مابین
(Between the Divine Promise & the faked Jewish Promise)

• فلسطین: ملک بدری، منتقلی یا اخراج (Palestine: Exile:Emigration or Expulsion)

• فلسطین ۱۹۴۸ء- پوشیدگی(Falastin 1948- The Concealment)

•۱۹۷۰ء تک فلسطینی تاریخ نویسی نے یورپ اور اس کی ثقافت کو جھٹلانے اور رد کرنے کے ماحول میں کام کیا اور امن کوششوں کو مسلط کرنے کے حق کو مسترد کر دیا۔ ابتدائی تاریخ نویسی کا طرزِ تخاطب کڑواہٹ سے بھرپور تھا اور یورپ کے عربوں کی جانب غیر منصفانہ رویے کا تاثر پیش کرتا تھا۔ جس میں نمایاں طور پر مغرب کی صیہونی عرب مخالف سازش کا ذکر کیا گیا۔ اس ابتدائی تاریخ نویسی میں عرب قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے فوری طور پر یورپ کے خلاف عرب دنیا میں اتحاد کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنے کی امید ظاہر کی گئی۔

•۱۹۷۰ء کے اوائل میں اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں نے تاریخی تحقیق اور اس کی خصوصیات پر اثر مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اندرونی سطح پر عرب دنیا نے ۱۹۶۷ء کی شکست کا سامنا کیا اور اس کی مایوسی ابھر کر سامنے آئی۔ فلسطینی تاریخ نویسی نے اس موقع پر خود کو عرب دنیا کے نظریے سے علیحدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس خاص انفرادی خصوصیت کی طرف لوٹنا شروع کر دیا تھا جو قدیم تصورات کے پس منظر میں ان کی قومی شناخت ثابت ہو سکے۔ ۲۰ ویں صدی عیسوی کے اوائل میں رونما ہونے والے واقعات کی تاریخی نقشہ بندی اور تحقیقی طریقہ کار میں جدت پسندی اور کھلے ذہن سے ان طریقہ ہائے کار کے استعمال نے تعلیمی سطح پر فلسطینی تاریخ نویسی میں نسبتاً زیادہ تحریک پیدا کر دی ہے۔ ان کے محققین کے اہم مقاصد میں فلسطین کی آزادی کی تحریک کے مقاصد کی توجیہہ پیش کرنا اور فلسطینی شناخت اور عرب قومیت کے عرب دنیا میں نئے مقام کے مسئلے کو حل کرنا ہے۔ ان چند سالوں میں وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اضافی تحقیقی مواد میسر آیا ہے جس نے نہ صرف قدیم فلسطینی تاریخ بلکہ عرب اور اسرائیل کے مابین چپقلش کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس تحقیقی مواد کا ذریعہ وہ دریافتیں بتائی گئی ہیں جو اوغاریت، عبیل، نوزی اور تل الحریری کے آثار قدیمہ کی کھدائی، برطانوی اور اسرائیلی علمی ذخائر (دستاویزات جو محققین کی دسترس میں تھیں) اور اسرائیلی نئے تاریخ نویسوں کی تحریریں شامل ہیں۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں روایتی تاریخ نویس بھی جنہوں نے مغرب سے تربیت حاصل کی تھی محققین کے اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ کچھ معاملات میں یہ لوگ یونیورسٹی کے تحقیقی اداروں کے سربراہ کے طور پر مانے ہوئے افراد تھے اور اپنے ہی لوگوں کی نئی تاریخ پر کام کر رہے تھے۔ اس کی بہترین مثال ولید الخالدی ہیں۔ یہ محققین اپنی پچھلی نسل کی نسبت مغرب کو منفی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برعکس ان کا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے۔ وہ مغرب کی فلسطینیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی طاقت سے آگاہ ہیں۔ انہوں نے مغربی طریقہ تحقیق اپنانا شروع کیا تاکہ مغرب کو فلسطین کے مسئلے کو عرب نقطہ نظر سے سمجھنے پر راضی کر سکیں، لیکن یہ مغرب کی سیاسی وثقافتی برتری کا اقرار اور ان کی تقلید کرنے کی خواہش کی طرف قابل شناخت اشارہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک باضابطہ رائے یہ تھی کہ عرب دنیا کو صیہونی تشہیر کے طریق کار کا مطالعہ کر کے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ تاریخی تحریروں کے ساتھ ساتھ کچھ یہودی لیڈروں نیتن یاہو، بن گوریان، ویلز مین، ہرزل اور سلمان پریس کی تحریروں کے جامع تراجم بھی کیے گئے۔

مورخین کی نئی نسل نے فلسطینی تاریخ نویسی میں یہ بھی تبدیلی کی کہ انہوں نے مذہبی شدت پسندی کے اظہار سے اجتناب کیا اور جارحانہ اندازِ اظہار ترک کر دیا، مگر وہ فلسطین کے علاقہ میں فلسطینی قوم کے حقوق کو ثابت کرنے میں کم پر عزم نہ تھے اور اس ذریعے سے یہودیوں کے اس علاقہ پر حق سے سختی سے انکاری تھے۔

تاریخ نویسی میں اصطلاحات کا استعمال

الفاظ اس لیے بھی بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اندر ہی اخلاقی قدر و معانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھتے ہیں۔ جیسا کہ صیہونیوں نے فلسطین میں یہودیوں کے بسنے کے عمل کو روحانی عمل سے منسوب کرنے کے لیے Olim (یعنی مائل بہ عروج) کا لفظ استعمال کیا کہ گویا وہ پستی سے بلندی کی جانب رواں دواں ہیں۔ جبکہ عرب نے اس پوری صورت حال سے وقار کا لبادہ اتارنے کے لیے ایک عمرانیاتی اصطلاح ''تارک وطن'' استعمال کی۔ اس حوالے سے اس خاص طریقے پر توجہ دینی چاہیے جو ولید الخالدی نے اپنایا ہے۔ انہوں نے فلسطین کے مسئلے کو مغربی شعور میں آگے بڑھانے کے لیے تکنیکی اور طنز آمیز اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے فلسطینیوں کو مقامی باشندے اور صیہونیوں کو نو آبادیات پر قبضہ کرنے والے کہا ہے۔ فلسطینی باشندوں کے فلسطین سے جانے کو ''ہجرت سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان الفاظ کا چناؤ ایک قسم کی زبانی اور علمیاتی سازش ہے۔ ''نو آبادیات کا لفظ صیہونیوں سے منسوب کیا گیا ہے جس کا مقصد یہودیوں کا ماضی کے اس نفوذ سے تعلق پیدا کرنا ہے جو مابعد جدیدیت میں سیاسی طور پر ایک مثبت لفظ نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری طرف لفظ ''گروہی خروج'' کا استعمال جو بائبل میں استعمال ہوا مغربی شعور میں اس کا تعلق یہودیوں سے قائم کیا جاتا ہے۔ لیکن ادھر اس کی شناخت فلسطینیوں کے ساتھ کی گئی ہے۔ مزید برآں مقامی باشندوں کا لفظ مابعد نو آبادیاتی دور میں فلسطینیوں کے ان کے آبائی وطن پر ہر قسم کے حق کے بارے میں کسی بھی قسم کے شبہ کا امکان خارج کر دیتا ہے۔ ہم آگے چل کر مزید اصطلاحات اور علامات کی مثالیں پیش کریں گے جو فلسطینی تاریخ نویسی میں قومی شناخت کی تعمیر کے لیے ایک زبانی اور بصری ذریعہ ہیں۔

فلسطینی مورخین نے Philistinies کی اصطلاح استعمال کی جب کہ کبھی کبھی وہ قدیم فلسطین میں اسرائیل مخالف گروہ کی بات کرتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی مورخ ان دونا موں کے مابین فرق کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں Palestinian کے لفظ کا استعمال موجودہ فلسطینیوں کا تعلق قدیم زمانے سے جوڑنے کی کوشش ہے اور اپنی شناخت کی جڑوں کا تعلق بائبل سے جوڑنا مقصود ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی کوشش ہے جس طرح صیہونی تاریخ نویس اپنا تعلق بائبل میں ذکر کیے گئے اسرائیلیوں سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اقرار کیا گیا ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''فلسطینیوں'' سامی لوگوں میں سے نہیں۔ اگر چہ عصام سخنینی کے کام میں اس سوال کا جواب موجود ہے جہاں وہ ایسے نظریات کی موجودگی کا اقرار کرتا ہے جن کی رو سے ان کا یورپی لوگوں میں ہوتا ہے، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس کے خیال میں ابتدائی تاریخی دور میں سامی لوگوں کے ارارات میں بسنے کے کافی شواہد موجود ہیں اور یہ کہ قدیم فلسطینی دراصل انہی سامی لوگوں میں سے ہیں جو یونانی باشندوں سے گھلنے ملنے کے بعد واپس آ گئے تھے۔

علاقے کے نام پر فلسطینی اور صیہونی دونوں تاریخ نویسوں نے بہت بحث کی ہے۔ دونوں تاریخ نویسوں نے علاقے کے انہی ناموں کا حوالہ دیا ہے جو اس کے مخالف تاریخ نویسوں نے اس علاقے کا ذکر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔ جیسا کہ عصام سخنینی نے دعویٰ کیا ہے کہ علاقے کا نام فلسطین رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ عبرانیوں کے ہاں اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے فلسطین اور اسی لفظ کی مختلف اشکال اس علاقے کے نام کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اور ان ناموں کا استعمال مصری، یونانی، شامی، رومی، عربی، ترکی اور برطانوی لوگوں نے کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہودیوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اسرائیل سرزمین کا لفظ استعمال کرنے کو ترجیح دی ہے تاکہ بائبل کے مندرجات کی روشنی میں یہودیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان تعلق پیدا کیا جا سکے۔

بہت سے عرب خاص طور پر مذہبی مؤرخین اسرائیل کی انفرادی سیاسی حیثیت کو نہیں مانتے اور خود کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے شبہ سے بالاتر رکھنے کے لیے اسرائیل کا لفظ ہی استعمال نہیں کرتے۔ اسرائیل کا نام واوین اور قوسین میں تو خوب چھپتا ہے لیکن اور جگہوں پر اس کے ساتھ توہین آمیز اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ مورخین کی بڑی کثیر تعداد اسرائیل کو نوعِ صیہونی یا سیاسی وجود کہتے ہیں۔

عرب فلسطینی مورخین نے ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہاتھوں فلسطین کی فتح کو بیرونی طاقتوں سے آزادی کے طور پر بیان کیا ہے جیسا کہ الیاس اصفہانی لکھتے ہیں: ''عرب فتوحات دراصل بڑی حد تک قومی اور معاشرتی آزادی کے لیے تھیں اور یہ حیرانی کی بات نہیں کہ فلسطین بہت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلد ہی قومی مملکت اور دارالسلام کا حصہ بن گیا''۔

اس کے لیے فتح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو ایک مقدس مشن کا مفہوم رکھتا ہے۔ دوسری طرف ''احتلال'' کا لفظ جبری فتح کے مفہوم میں آتا ہے اور عرب بحث ومباحثے میں یہ لفظ بازنطینی، صلیبی، برطانوی اور اسرائیلی جارحیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فلسطین کو ایک قدیم عرب سرزمین قرار دینے کے رجحان کا اظہار عربوں کے، ان قوموں اور ریاستوں کے ساتھ رویے میں بھی ہوتا ہے جنھوں نے جودیہ اور اسرائیل کے علاقوں پر حملے کیے۔ فلسطینی تاریخ نویس ان انتہا پسندانہ روایات کو ایک مثبت عنصر تصور کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک غیر پیشہ ور تاریخ دان محمد یوسف العوملہ نے بنوخدنصر کے جودیہ پر حملے کو ملک کے یہودیوں کے قبضے سے آزادی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے مطابق بنوخدنصر نے ۵۸۶ء میں گرجوں کو تباہ کر دیا اور ۴۰ ہزار لوگوں کو منتقل کر دیا تا کہ طفیلی نظام حکومت کو فلسطین سے مٹا کر سلطنت اس کے اصل باشندوں کے حوالے کر دی جائے''۔

بہت سے مؤرخین نے موسیٰ کی قوم کی بجائے ''اسرائیل کی اولاد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور اس کا مقصد حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوبؑ کی نسلوں کے درمیان تعلق کی نفی کرنا ہے۔ ان مورخین کے خیال میں جو قبیلے قحط کے دوران مصر کی طرف چلے گئے تھے وہ اپنے مصری پڑوسیوں میں ضم ہوتے ہوتے بالکل ہی ناپید ہو گئے۔ چنانچہ ان کے نظریے کے مطابق جو قبیلے بارہویں صدی عیسوی میں مصر سے کنعان کی طرف آئے ان کا اسرائیل کی اولاد سے کوئی نسبتی تعلق نہیں۔

ان اصطلاحات کے علاوہ فلسطینی تاریخ نویسوں نے اپنی نظریاتی سوچ کی منتقلی کے لیے بصری علامات کے استعمال کا اضافی طریقہ کار اپنایا۔ مثلاً

زیتون کا درخت: فلسطین کی تاریخ کی اکثر کتابوں پر زیتون کے درخت کی توضیحی تصویر ہوتی ہے۔ اس کا وجود فلاح (کسان) اور اس کی زمین کے درمیان ہزارہا سال کے تعلق کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ تعلق بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے زیتون کے درخت کا تعلق اس زمین سے ہزارہا سال پرانا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چٹان (مسجد قبۃ الصخرہ): مسجد قبۃ الصخرہ کا گنبد یروشلم کے مقدس ہونے کی علامت بن چکا ہے اور تاریخ کی بہت سی کتابوں پر اس کی تصویر ہوتی ہے۔ قابل غور بات وہ غیر متناسب امتیاز ہے جو مسجد اقصیٰ اور مسجد قبۃ الصخرہ کے مابین برتا گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ شاذ و نادر ہی تشہیری مقاصد کے لیے بصری آلۂ عکاسی کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔ حالانکہ سنہری گنبد والی باوقار عمارت بننا زیادہ اثر انگیز ہے اور اس کی تصویر بھی زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔

ترنج کا پھل: فلسطینیوں کو اس بات پر بہت فخر ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ترنج کے پھل کی کاشت کی اور اس کی تجارت بھی کی۔ وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ صیہونیوں کی آمد سے پہلے ''یافا'' ترنج کے پھل کے بہت بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا۔ جیسا کہ ولید الخالدی کے مطابق دوسری جنگ عظیم تک فلسطین کی کل برآمدات کا اسّی فیصد حصہ ترنج کی برآمد پر مشتمل تھا۔ وہ یافا کے کینو کی تعریف کرتا ہے اور اسے فلسطین کی طرف سے دنیا کے لیے تحفہ قرار دیتا ہے۔ اور صیہونیوں کی طرف سے اعلیٰ معیار کا اعزاز لے جانے پر اعتراض کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق کینو کے معیار کی وجہ فلسطینی کسانوں کا وہ وسیع تجربہ ہے جو انھوں نے اس کی کاشت میں استعمال کیا۔

تاریخی اور نسبی دعوے

ایک اور نمایاں دعویٰ جو فلسطینی تاریخ نویسی میں ملتا ہے یعنی عرب، نسلِ کنعان اور یبوسی نسل میں سے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دعویٰ عرب لوگوں کی فلسطین کی سرزمین میں مسلسل موجودگی کے مورخین کے دعوے کو تقویت بخشتا ہے. زیادہ تر کیا جانے والا دعویٰ یہ ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح کے اوائل میں جبکہ بعض کے خیال میں اس سے بھی پہلے اموری، کنعانی، یبوسی اور فینیقین گروہ ہجرت کر کے فلسطین کی سرزمین پر آ بسے تھے۔ انہی گروہوں نے جو دو ہزار سال قبل مسیح کے دوران فلسطین کے زیادہ تر شہر تعمیر کیے اور یہ سب عبرانی لوگوں کے یہاں آنے سے صدیوں پہلے ہوا۔

فلسطینی تاریخ نویسوں کے تاریخی دعوے دراصل مسلمانوں کی ساتویں صدی عیسوی کی فتوحات اور ان کی ہجرت کے درمیان ربط پیدا کرنے کی متحدہ کوشش ہے تاکہ مسلمانوں اور کنعانیوں کے مابین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مسلسل سلسلہ بنا سکیں۔ اسی طریقہ کار کی ایک اور کڑی اسامہ ابو نجیل کے تحقیقی کام میں نمایاں ہے۔ ہجرت کے مختلف ادوار کے بارے میں بتانے اور ان جگہوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اس نے اس جملے کے ساتھ اپنی بات مکمل کی:

''ساتویں صدی عیسوی میں سامی ہجرتوں کے بڑے بڑے ادوار میں سے مسلمان آخری دور کے فاتح تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ سامی بمشکل ہی عرب سے کوئی مختلف طبقہ ہیں البتہ ان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔''

جس طرح عرب اور فلسطین کے درمیان براہ راست تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی اولاد اور یہودیوں کے مابین تاریخی تعلق کو توڑنے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ اہم دلیل تین دعووں پر مشتمل ہے۔ اول تو یہودیوں کے جودیہ (Judia) سے نکالے جانے اور صیہونیوں کی واپسی میں طویل وقفہ ہے۔ دوسرا یہ کہ کنعانیوں کے سکونت کے دور کے مقابلے میں عبرانیوں کی کنعان میں موجود ہونے کی مدت غیر اہم اور معمولی سے وقت کے لیے ہے۔ تیسرا یہ کہ بائبل میں جن ابراہیم کا ذکر ہوا ہے ان کی اولاد اور موجودہ یہودیوں کے درمیان کوئی نسبی تعلق نہیں۔ دونوں قسم کے تاریخ نویس خواہ مذہبی رجحان رکھنے والے ہوں یا سیکولر یہودیوں اور ابراہیم کے بیچ نسبی تعلق کی تردید کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے خیال میں حضرت ابراہیم یہودی نہیں تھے اور ان کا یہ نظریہ ان کی ایک قرآنی آیت پر مبنی ہے جو یہ ہے: ''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی مگر ایک اللہ کو ماننے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ بت پرست تھے''۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کے اعلیٰ سلسلہ نسب کے مقابلے میں عبرانی قبیلوں کا تعلق معمولی سلسلہ نسب کے حوالوں سے جوڑا جاتا ہے۔ اور اس نظریے کو مغرب کی آثار قدیمہ کی تحقیق سے سہارا دیا جاتا ہے۔ العمارنہ اور نوزی آثار قدیمہ کے باقیات میں قدیم وقتوں میں ہجرت کرنے والوں کی فہرست موجود ہے۔ اور اس میں عبرانی یا عبرا کا ذکر ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ عبرا کسی نسل کا نام نہیں بلکہ ایک سماجی طبقہ ہے جو ان ماہرین کی نمائندگی کرتا ہے جن کی سماجی سلسلہ مراتب میں کوئی جگہ نہیں اور یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ لوگ تھے جو اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتے تھے جو ان کی خدمات کا تقاضا کرتے تھے۔ عرب مورخین نے ان نتیجوں کا انتخاب کیا ہے اور انہی کی بنیاد پر ایک مذہبی راہنما خلیل ابراہیم مسونہ نے تورات کے لکھے جانے کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

''اپنی سماجی مایوسی اور نچلی سماجی حیثیت (جس پر وہ گرا دیے گئے تھے) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اور دوسروں کی زمین پر قبضہ کرنے کی خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے یہودیت کو اپنانا شروع کر دیا تا کہ اس بات کا دعویٰ کر سکیں کہ یہ زمین با اختیار خدا نے اپنے وعدے کے مطابق ان کو دی ہے اور یہ بھی کہ وہ حضرت ابراہیم کا جانشین ہونے کا دعویٰ کر سکیں اور اس طرح ان کی خیالی دنیا انہیں ایک ایسی زمین، جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں، کی شناخت بنانے میں لگا دیا ہے''۔

مذہبی دعویٰ: مذہبی مورخ اسرائیل کی سرزمین پر مسلمانوں کا حق سمجھتے ہیں اور اس کی بنیاد ان کے نبی حضرت محمدؐ اور فلسطین کے درمیان تعلق اور ان کے درمیان معاہدے (سورۃ بنی اسرائیل) میں ہے اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح رات کے وقت مکہ سے یروشلم تک کی سیر ایک گھوڑے براق پر کروائی اور وہ ان کو جنت کی طرف لے گیا۔ اور اس طرح سے ان دو باتوں کو جن کو اسلام میں مقدس تصور کیا جاتا ہے، یکجا کیا گیا ہے۔ یہ آیت عرب بحث ومباحثہ میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے اور نہ صرف مذہبی بلکہ سیکولر مورخین کی تاریخی تحریروں میں ابتدائی کلمات کے طور پر لکھی جاتی ہے۔

یہودیوں کے دعووں کی بنیاد بائبل میں موجود وعدے پر ہے۔ بہت سے فلسطینی مورخین صیہونیوں کے ان کے آبائی حق کے دعوے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بائبل کے متن کی جانچ پڑتال اور اس پر کیے گئے اس تجربے کا سہارا لیتے ہوئے جس میں کچھ اسرائیلی محققین کا بھی کام ہے جن میں اوزی اورنن اور اسرائیل (Israel) فنکلسٹین شامل ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تورات خدا کی دی ہوئی کتاب نہیں بلکہ انسان کی اپنی سیاسی مقاصد کے لیے لکھی گئی دستاویزات ہیں اور اس کا منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ اسماعیلؑ اور عیسیٰؑ کو ان کی وعدہ کی گئی وراثت سے محروم کر کے اس وراثت کو صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسرائیل کی اولاد تک محدود کر دیا گیا ہے۔

مذہبی اور سیکولر دونوں طرح کے مورخین نے خدائی وعدے کے مطابق یہودیوں کے فلسطین پر حق کو جھٹلانے کی کوششوں میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ مذہبی تاریخ نویسوں نے بشارتی وعدے کی زد میں ارضِ موعودہ پر بائبل کے مطابق یہودیوں کے مذہبی حق کے دعوے کو مسترد کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک من گھڑت کہانی ہے اور اس کی وجہ تورات کا اکابرین اور بادشاہوں کے ساتھ غیر اخلاقی اعمال جیسے جھوٹ، چوری، قتل اور زنا کا منسوب کرنا ہے۔ ان (مسلمانوں) کے مطابق یہ اکابرین اور بادشاہ دراصل اللہ کے نبی ہیں جو لوگوں کی طرف بھیجے گئے اور جو معصوم (گناہوں سے پاک) ہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بائبل میں موجود کہانیوں کا اصل ماخذ خدائی نہیں بلکہ انسانی ہے۔ اور یہ کہانیاں انسانوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تخلیق کی ہیں۔ صالح الرکیب، ایک مذہبی مورخ بائبل میں موجود اکابرین اور بادشاہوں کے گناہوں کی کہانیوں پر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''ایک عقلمند آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہوگا کہ تورات نامور انبیاء کے ساتھ کس طرح گھٹیا زیادتی، سازش اور قانون شکنی کے کام منسوب کر سکتی ہے اس لیے ایک انسان یہودیوں کے اس دعوے کو کہ 'وہ واحد قوم ہیں، جو خدائی وعدے کے حق دار ہیں کے بارے میں تذبذب کا شکار رہے گا''۔

سیکولر مورخین کے مطابق وعدے کے دونوں رخ اور اس سے مستفید ہونے والوں کے بارے میں بائبل کا متن واضح نہیں۔ ان کے خیال میں وعدے کے فارمولے سے کوئی بھی فرض نہیں کر سکتا کہ اسحاقؑ ہی وہ واحد فرد ہیں جو اس وعدے سے مستفید ہونے والوں میں سے ہیں۔ کیونکہ جب خدا نے اس زمین کا وعدہ ابراہیمؑ اور اس کے جانشین سے کیا تھا تو خدا نے اسماعیلؑ کو ان سے فائدہ اٹھانے والوں کی فہرست سے خارج نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں جس وقت ابراہیمؑ سے یہ وعدہ کیا گیا اس وقت اسحاقؑ پیدا نہیں ہوئے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانونی دعوے

قانونی دعویٰ جس کی بنیاد پر فلسطینیوں نے فلسطین پر اپنے حق کی بات کی وہ ان قومی تحریکوں کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہیں جو پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر یورپ میں لوگوں کے حق خودارادیت کے لیے چلیں۔ اصول یہ ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ جن کا مشترکہ ماضی مشترکہ زبان ہو اور وہ ایک علاقے میں رہتے ہوں وہ ایک قوم ہیں جن کے پاس حق خودارادیت اور مملکت کا لازم ہونا ہے۔ جہاں تک یہودیوں کی بات ہے تو ان کے پاس یہ حق نہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہودیت ایک مذہب ہے، قومیت نہیں۔

ایک اور دلیل جو کہ صیہونیوں کے علاقہ حاصل کرنے کے بارے میں ہے کہ اسرائیل کا وجود دراصل بین الاقوامی قانون کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے کیونکہ یہ فتح اور بے دخلی کے عمل کے بعد وجود میں آیا ہے۔ یہ الزام صرف اسرائیل پر ہی نہیں بلکہ ان بڑی طاقتوں پر بھی ہے جنھوں نے یہودیوں کے فائدے (جو دراصل ان کے خفیہ مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ بھی تھا) کے لیے کام کیا جس کا آغاز، زمین کی ملکیت کی رجسٹریشن کے طریقہ کار کی تبدیلی اور پھر اس کی یہودیوں کو برطانوی دور حکومت اور عثمانی سلطنت کے زوال، سے ہوا۔ اور اعلان بالفر اور یہودیوں کی بڑی تعداد کو ہجرت کے حقوق دینے تک جاری رہا اور پھر اس کا اختتام تقسیم کے فیصلے پر ہوا۔

بالفر کے اعلان اور تقسیم کے منصوبے کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور سب سے نمایاں خیال جو سامنے لایا گیا وہ یہ تھا کہ یہ تمام کام بین الاقوامی قوانین کے اصولوں کے مطابق نہیں تھے اور یہ مسئلہ بیان الحوت کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ جنھوں نے وہ بیانات پیش کیے ہیں جو عام طور پر فلسطینی تاریخ نویسی میں بالفر کے اعلان کے حوالے سے آتے ہیں پہلا یہ کہ:

> ''یہ ایک ایسا وعدہ تھا جو اس (ملک) نے کیا جس کے پاس یہ وعدہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا اور جن سے وعدہ کیا گیا ان کے پاس بھی اس وعدے سے استفادہ کا کوئی حق نہ تھا''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور رائے جو ولید الخالدی کی تحریروں میں سامنے آئی اس میں انہوں نے اقوام متحدہ کے تقسیم سے متعلق فیصلے کو غیر منصفانہ قرار دیا کیونکہ اس فیصلے نے اکثریت کی خواہش کو نظرانداز کرتے ہوئے فلسطین کی سرزمین پر یہودی بستی کی تعمیر کے لیے راہ ہموار کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے ناقابل فہم فیصلہ بھی قرار دیا کیونکہ اقوام متحدہ نے یہودیوں کو اصل سے آٹھ گنا زیادہ بخش دیا۔ اس نے تقسیم کے منصوبے کو حضرت سلیمان کے فیصلے کے بائبل کے مفہوم سے بہت ہی موثر انداز میں منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ عرب دنیا نے اس سرزمین کے اصل مالک کی حیثیت سے ایک ماں کی طرح رویہ اپنایا ہے جس نے اپنی اولاد کو دو حصوں میں بانٹنے کی بجائے اس سے دستبردار ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''یہودیوں نے پورے نوالے سے بھی زیادہ وصول کیا ہے جبکہ عرب کے پاس آدھے سے بھی کم آیا ہے''۔

☆☆☆☆

© rasailojaraid.com